رشتہ گونگے سفر کا

رشتہ گونگے سفر کا

مظہر امام

شب خون کتاب گھر۔ الہ آباد

مظہر امام کا دوسرا مجموعۂ کلام

اس کی اشاعت میں بہار اردو اکیڈمی کا مالی تعاون شامل ہے

سرورق • قیصر سرمست
نقش ثانی • صادق
کتابت • سوز دانا پوری
طباعت • لیبل لیتھو پریس، رمنہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
بلاک • ہنر آرٹ کالج، گورنمنٹ اردو روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
پہلی بار • ۱۹۷۴ء

قیمت • دس روپے

ملنے کے پتے • شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
آذرشس بک ہاؤس، مسکن کوٹھی، باقر گنج، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

رِشتہ گونگے سفر کا

اُن

کے

نام

جو ساتھ چل رہے ہیں

'زخمِ تمنّا' کے بعد

ڈوبتے ہوئے آدمی نے کہا
کل کا دن حسین ہو گا

شاداو

نظم

غزل

رشتۂ گونگے سفر کا

تمھارے لئے ایک نظم

تمھارے لئے میں نے اب تک کوئی نظم لکھّی نہیں ہے

وہ الفاظ، جن کے سہارے کبھی ہم کلامی کے آداب سیکھے تھے میں نے
وہ الفاظ اپنے مفاہیم کی کینچلی پھینک کر
دشتِ بے معنویت میں گم سُم کھڑے ہیں!

میں
اُن ساعتوں کی گذرگاہ پر آبلہ پا رواں ہوں
جو
دفتر کی،
بیوی کی،
بچّوں کی،
احباب کی، مِلکیّت ہیں!

میں اب وہ نہیں ہوں

جو مَیں تھا

اب اک مُردہ انسان کا کوٹ میرے بدن کی کثافت چھپائے ہوئے ہے

میں برسوں کی رُسوائیاں

اِس کی بوسیدہ جیبوں میں مدفُون کرنے میں مصروف ہوں

میں شانوں پہ روزِ ازل سے اسی جھوٹ کا بوجھ ڈھوتا رہا ہوں

جو میں ہوں

جو تُم ہو!

ذرا مُہر بر لب لفافے سے اپنی وہ بھُولی ہوئی داستانیں نکالو

جو اِس شہر کی سرحدیں توڑ کر

غیر مُلکوں میں تشہیر پاتی رہی ہیں

لطیفوں میں احساس کا زہر چھُپتا نہیں ہے

مسرّت، فقط نُورِ غازہ نہیں

صرف آرائشِ پیچ کا گُل نہیں ہے

کہ اِن اُونچی اُونچی دکانوں کے پیچھے وہی ڈھیر ہے رَدّیوں کا ــــــ!

یہ دُنیا اک ایسا مکاں ہے
جہاں کوئی کھڑکی نہیں
صرف دروازہ ہے ایک
اندر سے جو بند ہے
اگر کھول پائیں تو کھولیں
کہ اندر ہمیں ہیں!

وہ
مری رُوح کی شاہ زادی
مرے شوق وارماں کا مرکز نہیں
رات کے چند بے کیف لمحات کو چھوڑ کر
میرا اور اُس کا رشتہ
نہیں ہے کوئی
پھر بھی وہ میرے انفاس کی آمد و شُد کا حصّہ
مرے خون کی راز داں ہے!

وہ
تُمہارے نفس کی حرارت، تمہارے لہو کی روانی سہی
یہ بتاؤ: تُمہاری بھٹکتی ہوئی رُوح کا شاہزادہ بھی ہے ؟
رات کے چند بے کیف و پُر کیف لمحات کو چھوڑ کر
تُم سے کچھ اُس کا رشتہ بھی ہے ؟

بیستونِ الم کاٹ کر کوئی فرہاد جُوئے مسرّت نکالے اگر
ایک دو گھونٹ تُم بھی پیو
ایک دو گھونٹ میں بھی پیوں
اور پھر اپنا زادِ سفر —— اپنی رُسوائیاں
اپنے کاندھوں پہ دونوں اُٹھا لیں
اور اس طرح کھو جائیں اِک دوسرے میں
جیسے یہ آخری بار ملنا ہو
جیسے کبھی پھر نہ ہم مِل سکیں گے!

رشتہ گونگے سفر کا

یہ کس جنم میں
ہم
دوبارہ ملے ہیں
یہ خط
رنگ
قد
سب مجھے جانتے ہیں
مرے لمس سے آشنا ہیں

میں بھٹکا ہوں

کتنے سرایوں میں، صحراؤں میں

کئی کارواں مجھ سے آگے گئے

اُن کے نقشِ کفِ پا ابھی مشتعل ہیں

ابھی دُھول نے اُن پہ چادر بچھائی نہیں ہے

مجھ سے پیچھے

نئے کاروانوں کی گرد اُڑ رہی ہے

کچھ جیالے جواں

تازہ دم، تیز رو —

اور میں

وقت کی رہ گزر کا وہ تنہا مسافر

جو ہر قافلے سے الگ

رہ رَووں سے الگ

اجنبی سمت

یوں چل رہا ہے

کہ اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے!

تحیّر سے پیدا مسرّت کے آنسو لئے
اِس طرح ہم ملے، جیسے پہلے کبھی مِل چکے تھے
کون سے کارواں سے بھٹکتی ہوئی
تُم دوبارہ اِدھر آگئی ہو؟
تمہیں کون سی منزلِ زندگی کی طلب ہے؟

تُمہاری رگوں میں بھی
میری رگوں کی طرح
کتنی صدیوں کا خُوں
کتنی نسلوں کا خُوں
موج زَن ہے
اور یہ ساری نسلیں
شکستہ، مگر اُونچی دیوار کی طرح اِستادہ ہیں

یونہی کب تلک فون پر بات کرتے رہیں گے !
یونہی فاصلہ جسم کا، لمس کا
ایک رِشتہ فقط صوت و آواز کا
یہ رِشتہ بھی حِصّہ ہے گونگے سفر کا
جو کب ٹوٹ جائے
کسے یہ پتہ ہے!

کاش یہ رشتۂ صوت و آواز ہی دائمی ہو
کہ گونگے سفر کے سبھی سلسلے عارضی ہیں!

اُکھڑتے خیموں کا درد

کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے
نہ روشنی میں، نہ تیرگی میں
نہ زندگی میں، نہ خودکشی میں

عقیدے نیزوں کے زخم کھا کر سسک رہے ہیں
یقین کی سانس اُکھڑ چلی ہے
نڈھال خوابوں کے ہونٹ سے خاک و خوں کے شعلے اُبل رہے ہیں
عزیز قدروں پہ جانکنی کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے
پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے
دلوں میں جن سے شعاعیں قوسِ قزح کے آنچل کی پھوٹتی تھیں

نہ فرد کا سائباں سلامت
نہ انجمن کا مکاں سلامت
کوئی خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟
کوئی خدا تھا تو وہ کہاں ہے؟

مہیب طوفاں مہیب تر ہے
پہاڑ تک ریت کی طرح اُڑ رہے ہیں
بس ایک آواز گونجتی ہے:
"مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!"
(مگر کہیں بھی اماں نہیں ہے)

جو اپنی کشتی پہ بچ رہے گا
وہی علیہ السّلام ہوگا!

دھوپ میں ایک مشورہ

تُم کہاں جاؤ گے؟
آج کے دن کہاں جاؤ گے؟
صُبح سے ہی ہوا گرم ہے
آفتاب اپنے خیمے سے پگھلا ہوا سیسہ برسا رہا ہے

بیٹھ جاؤ یہیں
اس خرابے میں تسکیں کے سامان ڈھونڈیں
تمھیں آج میں اپنے ماضی کی وہ داستانیں سُناؤں
جنہیں دوسروں سے ابھی تک نہیں کہہ سکا ہوں:

جگمگاتے تھے میری جبینِ مقدّس پہ
آدرش کے چاند تارے
آنے والے زمانے کے سورج
شہر کے جاگتے شور میں
میں نے اک اک کو آواز دی
میں نے اک اک سے پوچھا کہ تم مجھ کو پہچانتے ہو؟
ایک طنز آفریں خامشی میرے ہمراہ چلنے لگی!

میں نے اپنی روایت کے سارے لبادے اُتارے
اپنے چہرے کو تہذیب کے رنگ و غازہ سے نا آشنا کر دیا
اپنے آدرش کے چاند تارے بُجھائے
اور تب، لوگ —
گنوارے، شریف اور ریاکار —
میری طرف پیار سے دیکھ کر مُسکرانے لگے!

اشک آمیز قصّے سُنانے سے حاصل؟
زخم خوردہ عقیدوں پہ مرہم لگانے سے کیا فائدہ؟
اپنی مجبوریوں کی جبیں پر بھی اب جُھرّیاں پڑ چلیں
اپنے غم پر بھی فرسودگی کی سفیدی جھلکنے لگی!

تُم اگر بند کمرے سے باہر گئے
اپنے ملبوس سے جھانکتی وحشتوں کو چھپاؤ گے کس خول میں؟
لوگ گھبرا کے پوچھیں گے:
تُم قتل کر کے کسے آ رہے ہو؟
اور تُم
اپنے آدرش کی لاش کو
اجنبی، سرد، جلتی ہوئی رہگزر سے پرے پھینک کر
اپنا مفلوج غصّہ لیے لوٹ آؤ گے
پھر گڑگڑاتی ہوئی التجا....
'مجھ کو پہچاننے کی نہ کوشش کرو!'

سامنے کے دریچے میں مہتاب اُترے اگر
پھر چلے جاؤ گے
آج کے دن کہاں جاؤ گے ؟
تم کہاں جاؤ گے ؟
صُبح سے ہی ہوا گرم ہے !

اگر کھل گئی آنکھ

یُونہی چلتے چلتے اگر تھک گئے ہم
اگر راستے ہیں ہمیں نیند آئی
تو ہم اس سمندر سے آگے بڑھیں گے
پہاڑوں کی پہنائیاں ناپ لیں گے
اگر کھُل گئی آنکھ،
پھر چل پڑیں گے!

ایک صبح : مری ہوئی

صبح دم
میرے کمرے میں اک لاش پائی گئی

جوق در جوق
خلقِ خدا
کلمۂ خیر کہتی ہوئی
بے نیازانہ صدمے کا اظہار کرتی ہوئی
آگے بڑھتی رہی

اور میں
داہنی سمت کونے میں دبکا ہوا منتظر تھا
کہ کوئی سپاہی
مرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دے
اور کٹہرے میں لے جائے
تب زندگی سے میں دو بات پوچھوں ——— !

راستے کی تلاش میں

.... مگر ہم کو اس کی خبر ہی نہیں ہے
کہ جن کے لئے
ہم نے جینے کے انداز سیکھے
وہ اقدار کب کی فنا ہو چکی ہیں!

قرینے سے
الماریوں میں سجائی ہوئی
سرد، عاقل کتابیں
مجھے طنز سے دیکھتی ہیں ——!

چلو
آؤ
اُس راستے پر چلیں
جس کو دن بھر کی دُلہن بنا کر
اِک آوارہ سورج نے
خانہ بدر کر دیا ہے!

آئینے سے ٹپکتا لہُو

بِکھرا بِکھرا
اُلجھا اُلجھا
ٹُوٹا ٹُوٹا
کھویا کھویا
ٹیلی ویژن پر اِک چہرا
اپنا چہرہ مانگ رہا تھا

پوسٹ نہ ہونے والا ایک خط

کئی سال پہلے
ایک ماہ نامے میں
تمہارے بچوں کی تصویر میں نے دیکھی تھی
بہت ہی چھوٹے بہت ہی حسین بچے ہیں

بس ایک لمحے کو
ایسا خیال آیا تھا:
یہ بچے
کاش
مجھے
ماں
پکارتے ہوتے!

کھویا ہوا چہرہ

جانے یہ کون برس، کون صدی ہے، کہ یہاں
میری بجھتی ہوئی آواز کے مبہم سائے
اپنے ہی جسم کو یوں ڈھونڈ رہے ہیں، جیسے
رات کے وقت کوئی راہ میں سوزن ڈھونڈے!

اپنے زخموں کو لئے کتنے نگر گھوما ہوں
لے کے سامانِ سفر دُکھتے ہوئے شانوں پر
ہاتھ پکڑے ہوئے وحشت زدہ ارمانوں کا
اجنبی وادیوں، دریاؤں میں آ پہنچا ہوں

حسرت و غم کی تپش ریز گذرگاہوں پر
میرے رستے ہوئے چھالوں کے نشاں ملتے ہیں
زیست دم بھر کو جہاں بیٹھ کے سستاتی تھی
اب وہ پیپل کے گھنے سائے کہاں ملتے ہیں!

وقت، دَم سادھے ہوئے کانپ رہا ہے، کہ ابھی
زندگی، اپنی کمیں گہ سے نکل آئے گی
اور ٹھوکر اسے مارے گی، کہ: "چل، آگے چل!"

اِس سے پہلے کہ ملے وقت کو حکمِ رفتار
میرا کھویا ہوا چہرہ مجھے واپس دے دو
اپنے لب رکھ کے میں اُن ہونٹوں پہ سو جاؤں گا
جن کو چُومے ہوئے کتنے ہی برس بیت گئے!

رُوح میں سرخئ لب گھُل کے اُتر جائے گی
صُبحِ انفاس کی نکہت میں بسی آئے گی
پاؤں اُٹھیں گے اُسی شہرِ گذشتہ کی طرف
دل نے سیکھا تھا دھڑک جانے کا انداز جہاں
دَم بخود وقت مجھے دیکھ کے، یہ پوچھے گا:
"کیا ترے شوق کی وارفتہ مزاجی ہے وہی؟"

اپنے سوکھے ہوئے بالوں کی لٹیں بکھرائے
کون یہ گود میں بچّے کو لئے بیٹھی ہے!
اپنے گھر بار، در و بام سے اُکتائی ہوئی
"— کس لئے آئے ہیں؟ کیوں گھر میں گھُسے آتے ہیں؟
جائیے، جائیے، آفس سے وہ آتے ہوں گے
اجنبی شخص کو دیکھیں گے تو گھبرائیں گے
جانے کیا سوچیں گے، کچھ سوچ کے جھنجھلائیں گے"

کون وہ؟ کون یہ بچّہ؟ یہ تھکا سا چہرہ؟
کون میں؟ — اپنے ہی پیکر کا جھجکتا سایہ!
وقت، احساسِ خجالت سے جھکائے ہوئے سر
اپنی مجبور نگاہوں سے یہ کرتا ہے سوال:
"کیا ترے شوق کی وارفتہ مزاجی ہے وہی؟؟"

آنگن میں ایک شام

شام کی

لمحہ لمحہ

اُترتی ہوئی

دُھند میں

سر جھکائے ہوئے گھر کے

خاموش آنگن میں بیٹھے ہوئے

میری وا ماندہ آنکھوں کی جلتی ہوئی ریت سے

اِک بپھرتے سمندر کی آوارہ لہریں اچانک اُلجھنے لگیں!

شام کی

رستہ رستہ

اُترتی ہوئی دُھند میں

اس بپھرتے سمندر کی آوارہ لہروں کو
چوری چھپے
دفن کرنا پڑا
اُس کھنڈر میں
جہاں مُردہ صدیوں کے بھٹکے ہوئے راہ رو
چیختے پھرتے ہیں
اپنی ہی کھوج میں!

خوف کا سانپ
رگ رگ میں خوں کی طرح سرسراتا رہا:
رات کے چند بے کار لمحات کی رازداں
دیکھ پائے نہ بپھرے سمندر کی آوارہ لہروں کا چہرہ کہیں
اور پوچھے محبّت سے، اصرار سے:
"یہ بیٹھے بٹھائے تمھیں کیا ہوا
کچھ مجھے بھی کہو ۔۔۔!"

کنگال آدرش

اپنے آدرش کی مُفلسی مجھ پہ کیوں تھوپنا چاہتی ہو؟
یہ محبّت کی بنجر زمیں
جہاں پھول کِھلتے نہیں
جہاں چاندنی اپنا جلوہ دکھاتی نہیں
یہ محبّت
جو چُوٹھے سے بستر کی بھلّی شکن تک ہی محدود ہے
یہ محبّت نہیں
جبر ہے
خود غرض مادرانہ محبّت ہے یہ:
کسی شام احباب کے ساتھ دریا کنارے نہ جاؤں
کسی شب مئے ناب سے زندگی کو حرارت نہ بخشوں
کسی سہ پہر کو کسی سادہ رُو سے نہ اِک بار بھی مُسکرا کر کہوں:
"آج تم اِس نئے پیرہن میں بہت خوبصورت نظر آ رہی ہو!"

گوشت کا نغمہ

تجھ سے بچھڑے ہوئے
چھ سال ہوئے
وقت کی کوکھ میں کتنے لمحے
جل گئے
راکھ بنے

زندگی ایک نئے رنگ میں آئی ہے
کہ اب
گھر بھی ہے، بیوی بھی، بچّے بھی ہیں
شب کی تپتی ہوئی خاموشی میں
پھر بھی جب یاد تری نغمہ فشاں، نوحہ بلب آتی ہے

اپنی شہ رگ کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے کانوں میں مرے
میری آواز میں آواز تری گونجتی ہے
میرے خوابوں میں ترے خواب چمک اُٹھتے ہیں

کاش

اِک رات بھی
خلوت میں کبھی تو ہو میسّر آتی
پھر میں یہ فیصلہ کرتا
کہ محبّت میں تری
رُوح کا نغمہ بھی شامل ہے
فقط گوشت کی فریاد نہیں!

کھلے آسماں کے نیچے

وہ ترے الطافِ بے پایاں کی رات
وہ ترا اخلاقِ بے پروا، خلوصِ بے نیاز

میری جانب سے کوئی تحفہ نہیں
زیور نہیں
ساڑی نہیں
اُجرت نہیں
حد تو یہ، شادی کا وعدہ بھی نہیں

ٹھہرے ہوئے لمحے سے پرے

آؤ
کچھ دیر یہاں بیٹھیں
کوئی بات کریں
جنگ کا ذکر سہی
باغ کے ہنستے ہوئے پھول کی تعریف سہی
رقص اور سنگ تراشی کے مسائل پہ کوئی بحث سہی

یہ ضروری تو نہیں ہے کہ محبّت ہی کریں!

وہ ایک بات

میں نے اِک بات محسوس کی
میں نے وہ بات تُم سے کہی
تم نے اُس سے کہی
اُس نے اُن سے کہی
پھر مجھے بھی نہ اِس کی خبر ہو سکی
کِس نے کیا بات
کِس سے کہی!

رات کا قصّہ

ایک
پہچانا ہوا انجان شہر
رات کے کالے بدن پر برص کے اُجلے چراغ
آدمی کی کھال میں چیتے کی رُوح
جسم کے مرگھٹ پہ سانسوں کی چِتا جلتی ہوئی
نک چڑھی بیوی کی صورت
زندگی!

○

وُسعتیں اپنی لئے، سمٹی ہوئی دنیا میں ہوں
میں سمندر ہوں، مگر خود پیاس کے صحرا میں ہوں

میں نے ہی ماضی کے مرقد پر جلائے ہیں چراغ
میں مجاورِ حال کا ہوں، حجرۂ فردا میں ہوں

کور چشموں کے لئے کیا روشنی، کیا تیرگی!
سرمۂ غم ہی سہی، میں دیدۂ بینا میں ہوں

ایک ہی موسم ہے آنکھوں کا، الم ہو یا نشاط
میں مگر مچھ کی طرح احساس کے دریا میں ہوں

یہ دُعا کس لمحۂ حاضر کی ہے مجھ پر، امام!
ہوں صدائے عصر، لیکن گنبدِ فردا میں ہوں

○

یہ کیسے دور کا سقراط بن کے جینا تھا
بجائے زہر، مجھے گالیوں کو پینا تھا

وہاں تھی تندیٔ صہبا؛ یہاں شکستِ وجود
یہ سنگِ صبح ہے، وہ شب کا آبگینہ تھا

چھپی تھی موج کی باہوں میں رُوحِ تشنہ لبی
چمکتی ریت میں ڈوبا ہوا سفینہ تھا

اُکھاڑ لے گئے سایوں سے کھیلنے والے
ہزاروں سال کا گاڑا ہوا دفینہ تھا

لبِ سکوت سے بوسہ چرا لیا تھا جہاں
نگار خانۂ آواز ہی کا زینہ تھا

○

اپنی ہی یادوں کی بوسیدہ ردا لے جائے گا
میرے گھر تک بھی وہ گر آیا، تو کیا لے جائے گا

مانگنے والے! ذرا اپنی لکیریں بھی تو دیکھ
ساری تاثیرِ دُعا، دستِ دعا لے جائے گا

اُٹھ گئی ہے دوسروں کی راہ پر چلنے کی رسم
اب وہ اپنے ساتھ اپنا نقشِ پا لے جائے گا

خود فراموشی پہ میری بُھول مت بیٹھے، کہ وہ
میرے پاس آیا، تو اپنا بھی پتہ لے جائے گا

میری آنکھوں میں گذرتے موسموں کا عکس ہے
سیلِ صبح اِک روز اس کو بھی بہا لے جائے گا

اِس طرح گرنے نہ دو یادوں کی شبنم دیر تک
یہ خُنک سایہ بھی کوئی دل جلا لے جائے گا

الفِ لیلہ کا کوئی دیو زاد، شاہِ وقت کے
دستِ رعشہ دار سے اِک دن عصا لے جائے گا

اور کیا رکھا ہے میرے پاس لے جانے کو اب
میرا قاتل آئے گا، میری دُعا لے جائے گا

کوئی لشکر آئے گا طوفان کی صورت امام!
سر سے وہ خوابوں کا خیمہ بھی اُڑا لے جائے گا

○

کوئی نگاہ و دل کا خریدار ہی نہ تھا
ہم نے دکاں سجائی تو بازار ہی نہ تھا

لے دے کے ایک وصل کی خیرات مانگ لی
جیسے کچھ اور شوق کو آزار ہی نہ تھا

نایاب تھے گہر ہی کی مانند خشت و سنگ
یا اس نگر میں کوئی گنہ گار ہی نہ تھا

اِک دوسرے کے غم میں تھے سب اس طرح شریک
جیسے کسی کو مجھ سے سروکار ہی نہ تھا

سب ساتھ لے کے آئے تھے اپنی متاعِ جاں
میری طرح وہاں کوئی دل دار ہی نہ تھا

وہ کیا بدلتے حسن کا معیار اے امام!
اہلِ ہوس کے سامنے معیار ہی نہ تھا

○

سوچنے والے! اگر تُو مرا اپنا ہوتا
تُو نے میری ہی طرح خود کو بھی سوچا ہوتا

ہاں بُرا ہوتا، مگر اور بُرا کیا ہوتا
آستیں میں جو کسی سانپ کو پالا ہوتا

میں تو اِس حشرِ تماشا میں خدا بن کے رہا
تُو بھی اِس بھیڑ میں ہوتا تو اکیلا ہوتا

اب تو یہ غم ہے، ملاقات ہوئی کیوں تجھ سے!
تُو نہ ہوتا تو مرے ساتھ زمانہ ہوتا

اُس کی دہلیز کے سُورج کو اُٹھالے آتے
اپنی دیوار کا سایہ جو گھنیرا ہوتا

تُم نے آتش کدۂ شہر سے آنے والی
اجنبی چیخ کا انجام تو پوچھا ہوتا!

میں بھی اب سوچ رہا ہوں کہ تمہاری ہی طرح
بیچ کر خود کو یہ بازار خریدا ہوتا

Scanned with CamScanner

○

بے چہرہ منظروں کو بھی کچھ خدّ و خال دے
اِس تیز روشنی میں اندھیرا اُچھال دے

ایسا نہ ہو کہ ظاہر و باطن کھنگال دے
ہر صاحبِ نگاہ کی آنکھیں نکال دے

گرنے نہ پائے نقد کا معیار سطح سے
وہ بے مثال ہے تو ہماری مثال دے

لفظوں کی تیز دھوپ میں یہ بھی جھلس نہ جائے
فکرِ برہنہ جسم پہ چادر ہی ڈال دے

دیواریں ہِل رہی ہیں زمان و مکان کی
گرتا ہوا یہ گھر کوئی آ کر سنبھال دے

قیدِ حجابِ وقت سے باہر نکل کے آ
ہر وسوسہ دماغ سے اپنے نکال دے

○

اِس طرح اب سرِ منظر آؤں
اپنے سائے کے برابر آؤں

تو جو باہوں میں جکڑ لے بڑھ کر
میں فضاؤں میں بکھر کر آؤں

پیاس تیری بھی اگر بجھ جائے
پی کے میں سات سمندر آؤں

بھول جاؤں نہ سبق بچپن کا
لے کے پھر ہاتھ میں پتھر آؤں

ہو جہاں تو بھی نشانِ سرِ راہ
اُن فضاؤں میں سفر کر آؤں

ٹوٹنے دے یہ حصارِ لمحات
راستے بند ہیں، کیوں کر آؤں!

ہاتھ سوکھے ہوئے پتّوں کے پڑا دیں
جب سرِ شاخِ ثمر ور آؤں

گھر سے گھبراؤں تو نکلوں دمِ صبح
شام کو لوٹ کے پھر گھر آؤں

زندگی کیا ہے : مسلسل برداشت
خود کو اب توڑ کے باہر آؤں

Scanned with CamScanner

○

خون اوڑھے ہوئے ہر گھر کا سراپا نکلا
آپ کے شہر کا انداز نرالا نکلا

چھو کے اک شخص کو پرکھا تو ملمّع نکلا
اُس کو میں کیسا سمجھتا تھا، وہ کیسا نکلا

سچ کے صحرا میں اُنہیں ڈھونڈ کے تھک ہار گئے
جھوٹ کے شہر میں یاروں کا بسیرا نکلا

جس سے کترا کے نکلتے رہے برسوں سرِ راہ
اُس سے کل ہاتھ ملایا تو وہ اپنا نکلا

کہیں صحرا میں بھی ڈس لے نہ ہمیں سیرابی
ریت کے بطن سے پھنکارتا دریا نکلا

نرم رَو تھا، تو سبھی راہ سے منہ موڑ گئے
سنگ اُٹھایا، تو مرے ساتھ زمانہ نکلا

وادیاں، لفظ و معانی کی، تہِ آب ہوئیں
کن پہاڑوں سے خیالات کا جھرنا نکلا!

○

لبوں پہ جشنِ تبسّم بھی ، آنکھ تر بھی ہے!
فریب کار ہے یہ غم ، کہ معتبر بھی ہے؟

اُفق اُفق وہی بے منظری کا عالم ہے
میں خوش نظر ہی سہی ، حاصلِ نظر بھی ہے؟

جو اَب مُڑے، تو نگاہیں بھی نُور کھو دیں گی
کہ اپنی پُشت پہ گردِ پسِ سفر بھی ہے

نہ رکھ ہر اک سے توقّع کہ سر جھکا کے چلے
تری گلی ہی سہی، عام رہگذر بھی ہے

خوشی سے آگ لگاؤ کہ اِس محلّے میں
مرا مکاں ہی نہیں ہے، تمہارا گھر بھی ہے

لہو کی شمع بچائے رہیں ہواؤں سے
شکستہ راہ بھی ہے، رات کا سفر بھی ہے

○

سچ کہہ لو کہ یہ وقت مکرّر نہ ملے گا
یہ دل کی عدالت ہے، یہ محشر نہ ملے گا

اشکوں کی ردا اوڑھ کے اشجار کھڑے ہیں
اب چاند بھی نکلا تو وہ منظر نہ ملے گا

جاتے ہو تو بچّوں کو بھی ساتھ اپنے لئے جاؤ
جب لوٹ کے آؤ گے تو یہ گھر نہ ملے گا

کیا بامِ فلک بوس! کہ اس آتش و خوں میں
دیوار ملے بھی تو کوئی در نہ ملے گا

باہر تو ملیں گی تمہیں، ڈستی ہوئی آنکھیں
لیکن کوئی ان کمروں کے اندر نہ ملے گا

○

سانحہ یہ بھی اک روز کر جاؤں گا
وقت کی پالکی سے اُتر جاؤں گا

اپنے ٹوٹے ہوئے خواب کی کرچیاں
تیری آسودہ آنکھوں میں بھر جاؤں گا

کشتیاں، روشنی کی، بلاتی رہیں
ساحلِ شب سے ہو کر گذر جاؤں گا

اجنبی وادیاں — کوئی منزل، نہ گھر
راستے میں کہیں بھی اُتر جاؤں گا

میرے دشمن کے دل میں جو صدیوں سے ہے
وہ خلا بھی میں اک روز بھر جاؤں گا

دوستوں سے ملاقات کی شام ہے
یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا

۱۰۱۰۴

○

جن کے دل میں رخشندہ ہیں الہامی آیات
وقت کے بھاری شانوں پر وہ رکھ کر دیکھیں اپنا ہات

بیج نمک کے بونے والے، کھیتی میں مصروف
اب کے جانے کب تک ٹھہرے زخموں کی برسات!

ہم کیا اُن کی نذر کریں اب، چہرے پر آنکھیں ہی نہیں
پہلے دے کر خوش ہوتے تھے اشکوں کی سوغات

صبح کا تڑکا ہوتے ہوتے اُڑ جاتے تھے لفظوں کے سب رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے آدھی آدھی رات

"آج ہوا سو ہونا تھا (میں اُونچے گھر کی بیٹی ہوں!)
دیکھو پھر مت کرنا ایسی ویسی بات!"

کتنا گرم لہو ہے اپنا، دُنیا کو بھی دیکھنے دیں
رکھنا ہونٹ پہ ہونٹ اور دینا ہات میں ہات!

○

میں وہی ہوں کہ نہیں، غور سے دیکھو مجھ کو
مسئلہ جان کے، کچھ دیر تو سوچو مجھ کو

میں نے رگ رگ میں چٹانوں کی شعاعیں بھر لیں
اپنی تنقید کی میزان پہ تولو مجھ کو

ساحلوں پر مری تصویر بنانے والو!
بیچ دریا میں بھی اک بار ابھارو مجھ کو

میں ہوں دیوارِ تمنّا سے اترتی ہوئی دھوپ
اپنے احساس کے آنگن میں بٹھا لو مجھ کو

حسبِ معمول زمیں اپنی طرف کھینچ نہ لے
توڑ لو شاخِ ثمردار سے یارو! مجھ کو

میں تو اب سرحدِ معنی سے گزر جاؤں گا
تم کہاں پاؤ گے اس شہر کے لوگو! مجھ کو

○

وہ روشنی ہے کہ آنکھوں کو کچھ سُجھائی نہ دے
سکوت وہ، کہ دھماکہ بھی اب سُنائی نہ دے

پہنچ گیا ہوں زمان و مکاں کے ملبے تک
مری انا! مجھے الزامِ نارسائی نہ دے

اگر کہیں ہے، تو دل چیر کر دِکھا مجھ کو
تو اپنی ذات کا عرفان دے، خُدائی نہ دے

ازل کے ٹوٹتے رِشتوں کی اس کشاکش میں
پُکار ایسی ادا سے، مجھے سُنائی نہ دے

نکل چکا ہوں میں اپنی کمان سے آگے
تعلّقاتِ گزشتہ کی اب دُہائی نہ دے

○

رنگ کیا دکھاتا ہے خونِ رائگاں! دیکھوں
دھار تیز ہے کتنی، رکھ کے اُنگلیاں دیکھوں

ساتھ لے کے آیا ہوں اب اُنہیں کی تلواریں
اِک ذرا یہیں رُک کر رنگِ دُشمناں دیکھوں

شہر اُگنے والا ہے، سانس رُکنے والی ہے
جنگلوں کے جلنے کا دُور سے سماں دیکھوں

دوسروں کا قصّہ بھی اب نیا نہیں لگتا
کون سا وَرَق اُلٹوں! کس کی داستاں دیکھوں!

پُرسکون گھر میں بھی کیا وہی ہے ہنگامہ!
اُس طرف سے جب گذروں، بند کھڑکیاں دیکھوں

دُور تک مکینوں کے نقشِ پا نہیں ملتے
کون سا کھنڈر دیکھوں! کون سا مکاں دیکھوں!

اب تو ان مناظر کی شکل ہی نہیں بنتی!
آنکھ میں لہو لگ جائے میں جہاں جہاں دیکھوں

○

جب سر پہ آ پڑے گی تو غیرت بھی آئے گی
دستار گر گئی تو شرافت بھی آئے گی

تیشہ اُٹھا لیا ہے تو اب جو بھی زد میں آئے
اس راستے میں تیری عمارت بھی آئے گی

ایسا بھی کیا کہ کوئی خریدار ہی نہ ہو
جب بیچنے چلیں گے تو قیمت بھی آئے گی

دیکھا ہے ایک شخص دریچے کے آس پاس
اُس گھر سے اب ہوائے نفاست بھی آئے گی

ٹھٹھریں گی دُوریاں جو زمان و مکان کی
سانسوں میں اپنی گرمیٔ قُربت بھی آئے گی

ہونٹوں کی نرم گرم دوا پی کے دیکھئے
بجھتے ہوئے بدن میں حرارت بھی آئے گی

ہوتا ہے بار بار روابط کا امتحاں
اِس آئینے میں گردِ کدورت بھی آئے گی

یہ دورِ اختلاف بہت دیرپا نہیں
میری طرف وہ چشمِ عنایت بھی آئے گی

○

نیند گہری تھی، مگر چونک کے بیدار ہوئے
کن ہواؤں نے پکارا تھا کہ ہشیار ہوئے!

دشت میں تھے تو یہ زنجیر ملاقات نہ تھی
ہم ترے شہر میں پہنچے تو گرفتار ہوئے

اپنی ناکردہ گناہی نے وہ شہرت بخشی
ہم نمائش میں لگایا ہوا بازار ہوئے

دوست کیسا، کہ یہاں دشمنِ جاں بھی نہ ملا
ہر شناسا سے ہم آمادۂ پیکار ہوئے

جگمگاتی تھی جہاں سنگِ ملامت کی دکاں
اُسی بازار میں ہم تیرے خریدار ہوئے

سامنے، جوش میں تھے آگ لگانے والے
اپنا گھر دیکھ کے، ہم اُن کے طرفدار ہوئے

○

ترے خیال پہ بیتے دنوں کی مالا ہے
مگر، وہ دورِ قیامت، جو آنے والا ہے!

ہر ایک لاش پہ عائد ہے قتل کا الزام
یہ سانحہ ہے، مگر سانحہ نرالا ہے

ابھی سے ٹوٹتے لمحوں کی گرد اُڑنے لگی
یہ راستہ تو بہت دُور جانے والا ہے

وہی تو ہیں کہ جنہیں بولنا نہ آتا تھا
یہ کون لوگ ہیں، اب جن کا بول بالا ہے!

اِسی اُمید پہ اربابِ شہر زندہ ہیں
کہ اُس پہاڑ سے آگے بہت اُجالا ہے!

اب اِس کے بعد کوئی واقعہ بھی کیا ہوگا!
مرے وجود کا یہ آخری سنبھالا ہے

○

کئی دنوں سے ترے شہر میں یہ چرچا ہے
کوئی مسیح فلک سے اُترنے والا ہے

چراغ جلتا نہیں اور دھواں نکلتا ہے
ترے مکان میں جو کچھ نہ ہو وہ تھوڑا ہے

ہمیں خبر ہے کہ شیشہ گری کا فن کیا ہے
کہ ہم نے توڑ کے ذرّات کو بھی دیکھا ہے

سُنا ہے، موت نے کل رات خودکشی کر لی
نئے مریض سے کہہ دو: شگون اَچھّا ہے

پھر اس کے بعد وہی حبس بے وجودی کا
مجھے جو نام ملا ہے، ہوا کا جھونکا ہے

○

خشک پتّے بھی نہیں، یاسمنِ تر بھی نہیں
پسِ منظر بھی نہیں ہے کوئی منظر بھی نہیں

تُم نے اچھّا ہی کیا، توڑ دیں ساری سڑکیں
کوئی رہرو بھی نہیں اب کوئی رہبر بھی نہیں

آج کے دَور کی تصویر دکھائی دے گی
آ کے دیکھو یہ مکاں، چھت بھی نہیں، در بھی نہیں

بھیک مانگے کہ نہ مانگے، یہ طلب گار تو ہے
دل، جو مُفلس بھی نہیں اور تونگر بھی نہیں

کسی تالاب میں لہریں ہی بناتے، گِنتے
وہ تہی دست ہیں ہم، ہاتھ میں کنکر بھی نہیں

تم پہ یہ وقت پڑا ہو تو بتاؤ یارو!
دل کے اندر بھی نہیں ہے کوئی باہر بھی نہیں

○

برف کی آنکھ دہکتا ہوا شعلہ مانگے
زندگی مجھ سے مری عُمرِ گذشتہ مانگے

کوئی تو زینتِ آغوش ہو جب چاند کِھلے
سانس کا قُلزمِ بے تاب، جزیرہ مانگے

کون شیشوں کو چُنے! کون دلوں کو جوڑے!
دل وہ کافر ہے کہ پھر ایک شوالہ مانگے

تُم ہی آ جاؤ ذرا ہاتھ میں پتّھر لے کر
آئینہ اب مرا کھویا ہوا چہرہ مانگے

جَم چکی بَرف زدہ مُنہ میں زباں، دیر ہوئی
حرفِ ناگفتہ اب ابلاغ کا شعلہ مانگے

اُس صنم نے تو رفاقت ہی طلب کی تھی امامؔ!
ہر خذف ریزہ اب اپنے لئے سجدہ مانگے

○

اُکتا گئے ہیں لوگ، فسانہ کہا نہ جائے
کس سمت جا رہا ہے زمانہ، کہا نہ جائے

اپنا مکاں اُجاڑ کے، صحراؤں کی طرف
وہ شخص کیوں ہوا ہے روانہ، کہا نہ جائے

لمحوں کی طرح گذری ہیں صدیاں تو بارہا
اک پل بنا ہے کیسے زمانہ، کہا نہ جائے

شعلے بنے ہیں لفظ تو کانٹا ہوئی زباں
اب کیا کریں اگر یہ فسانہ کہا نہ جائے

آنکھیں اُفق پہ سنگ کی صورت اٹک گئیں
شب ہو گی کب سحر کا نشانہ، کہا نہ جائے

کہنے کو یہ غزل ہے، مگر کیا غزل! جسے
نوحہ کہا نہ جائے، ترانہ کہا نہ جائے

○

دل سے محو ہوئے جاتے ہیں غالب کے کلکتّے والے
گوہاٹی میں ہم نے دیکھے ایسے ایسے چہرے والے

موسم رنگ بدلتا ہے جب، وہ بھی کچھ سے کچھ ہوتے ہیں
آج بڑے بے باک ہوئے ہیں کل شب کے شرمانے والے

جب سے مری آواز کو تم نے اپنے ہونٹوں سے چوما ہے
مُنہ کو تلخ کیے پھرتے ہیں سارے شہد چرانے والے

تپتی ریت پہ چلتے چلتے ایک ذرا سی چھاؤں ملی ہے
اس کے بھی حق دار ہوئے ہیں سارے رشتے ناتے والے

شب کی اُبھری خشک رگوں میں اب تو لہو تک سوکھ چکا ہے
لاؤ، بلاؤ، آج کہاں ہیں صُبح کی مَے چھلکانے والے

ہم نے سُنا ہے دھوپ کڑی ہے، راہ میں موت بھی آجاتی ہے
جانے لوٹ کے کب آئیں گے دُور سفر پر جانے والے

○

پیشانی پر چاند لئے کون اُبھرا آدھی رات گئے
خون رگوں میں چہکا، بپھرا، چمکا آدھی رات گئے

سر کو پٹکتا تھا ساحل پر دریا آدھی رات گئے
سورج چاند سے ٹکّر لینے نکلا آدھی رات گئے

سارے بلب بجھے تھے لیکن سارا کمرہ روشن تھا
لمحہ چلتے چلتے ٹھٹکا، ٹھہرا آدھی رات گئے

درد کا بھولا بھالا چہرہ، جاگا سا، کچھ سویا سا
کیا بتلاؤں میں نے کیا کیا دیکھا آدھی رات گئے

ایک نویلی دُلہن بن کر اِک دن اندر آیا تھا
جانے کب کا بھولا بھٹکا لمحہ آدھی رات گئے

ایسے بھی دن آتے ہیں جب سانسوں کا دَم گھُٹتا ہے
جاگا کرتی ہے جب ساری دُنیا آدھی رات گئے

باہر آکر دیکھا تو شب سوئی تھی چٹّان بنی
میں جب اپنے خوابوں سے اُکتایا آدھی رات گئے

○

میں نے موت کا چہرا دیکھا
کتنا بھیانک، کتنا پیارا

فُٹ پاتھوں پر نیند پڑی تھی
سورج سر پہ آن کھڑا تھا

سایہ سایہ آگ لگی تھی
پتّہ پتّہ ہانپ رہا تھا

اک انجانی لاش کے آگے
پاگل کُتّا بھونک رہا تھا

بازاروں میں بھیڑ سوا تھی
دہلی کا دربار سجا تھا

ظاہر و باطن دونوں یکساں
مُنہ بھی کالا، دل بھی کالا

اور حقیقت کیا خوابوں کی
دن کے زہر کا شب کو نشّہ

○

پھول ہو زہر میں ڈوبا ہوا، پتّھر نہ سہی
دوستو! میرا بھی کچھ حق تو ہے، چُھپ کر سہی، کُھل کر نہ سہی

پھر سوال آج یہی ہے کہ ملے بودھ کو کیسے نروان
مسئلہ: زندگی و موت کا چکّر — نہ سہی

سانس لینا ہی اگر زیست کا معیار بنے
یہ بہت ہے کہ فلک سر پہ لیے ہے، دَر نہ سہی، گھر نہ سہی

آ، مرے جسم تک آ، ابرِ طرح دار کی طرح
یہ تو معلوم ہے تو جھانک نہ پائے گی مری روح کے اندر، نہ سہی

یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی، آپ کا پیکر نہ سہی

آج کے دَور میں یہ بھی ہے اِک احسانِ عظیم
غم تو دے سکتے ہیں افراد کو ہم، دل نہ سہی، سر نہ سہی

○

صدیوں ترسے دل کو آخر پیش میں کیا سوغات کروں؟
تجھ سے مِل کر جو پائی ہے، کیسے بسر وہ رات کروں!

جانے وقت کا ضدّی بالک شور مچا کر کب سو جائے
آ، اے غمِ محبوب! میں تجھ سے پچھلے جنم کی بات کروں

شاید اک دن دل کا مسافر نیند کی چوکھٹ تک پہنچے
دریا دریا صبح کروں اور صحرا صحرا رات کروں

رقص کہوں میں پاؤں میں گھنگھرو، روح میں بھاری سی زنجیر
اپنے خرابے میں ہی اب کے میں تو گذرِ اوقات کروں

سنّاٹے کے گہرے پَن میں گُم ہے اپنی بھی آواز
ڈھونڈ کے لاؤں کوئی دُشمن، اس سے دو دو بات کروں

دن کا سورج آگ اُگل کر آخر خود بھی راکھ ہوا
سُوکھی پیاسی رات پہ اپنے سپنوں کی برسات کروں

قرض کسی سے مانگ کے لاؤں تھوڑی سی موہوم اُمید
شعروں کے نقّاد کی خاطر تہذیبِ جذبات کروں

○

اِک مدّت سے مرے گھر میں کوئی آیا نہیں
اِن شناساؤں میں کوئی آشنا چہرہ نہیں

تُو نے مرنے کا بھی دل کو حوصلہ بخشا نہیں
زندگی! مجھ سے ترا اب کوئی سمجھوتہ نہیں

میرا حصّہ دُوریاں، ناکامیاں، خاموشیاں
یہ جہاں، سب کا جہاں، میرا نہیں میرا نہیں

پُل ہی پُل، سڑکیں ہی سڑکیں، عشق ہے بے امتحاں
آج رستے میں کوئی دریا نہیں، صحرا نہیں

خود غرض ہیں انجمن آرائیاں، تنہائیاں
آدمی کا آدمی سے اب کوئی رشتہ نہیں

آج کے بونے اُڑاتے ہیں ہمالہ کا مذاق
ہاتھ میں پتّھر بہت ہیں، سر کوئی اُونچا نہیں

وقت کا سورج سوا نیزے پہ کب کا آ چکا
آنکھ والوں نے قیامت کا سماں دیکھا نہیں

جس کے نسخوں سے شفا بیمار دنیا کو ملے
وہ صحیفہ آسماں سے آج تک اُترا نہیں

○

صحرائے کربلا ہے کہ میدانِ آرزو
کیا وقت آ پڑا ہے پسِ مرگِ جستجو!

ہے غم کی رات، تیز کریں گردشِ سبو
اب کے نچوڑنا ہے کڑے وقت کا لہو

دیکھو یہ اِتّفاق، مِلا آج پھر کوئی
بالکل تمھاری طرح، تمھیں جیسے ہُوبہو

اچّھا ہوا کہ غیر سے سب فیصلے ہوئے
تُم سے بھی بات کر لیں ذرا آج دُوبدو

ہم خود ہی اعتبار کے قابل نہیں رہے
کس مُنہ سے تم کو دوست کہیں، اور اُسے عدو

ہر آئینے سے آنکھ چُراتے ہیں آج ہم
کل تیری جستجو تھی کہ تھی اپنی جستجو!

اپنی ہی چیخ چار طرف سے اُبھر گئی
آواز دوستوں کو لگائی جو کُو بکُو

صدیوں کا خون پی کے بھی اب تک وہی ہے پیاس
دھرتی پکارتی ہے ابھی تک: "لہو! لہو!!"

چیخوں کے اژدہام میں تنہا ہے آدمی
اے زندگی! بتا، کہ کدھر جا رہی ہے تو؟

○

اس اضطرابِ شوق کی کوئی سزا تو دو
جاگا ہوا ہوں رات کا، دن میں سُلا تو دو

پھر اتنا شوخ رنگِ تماشا ہو یا نہ ہو
بازارِ التفات میں خود کو گرا تو دو

اُبھرے گا خود ہی قُرب کی لذّت کا ماہتاب
پہلے تُم احتیاط کی شمعیں بجُھا تو دو

دونوں کی اُلجھنوں میں ہے اِک ربطِ ناگزیر
اپنا پتہ بھی پاؤ گے، میرا پتہ تو دو

سنگِ گراں کی طرح کھڑے کیوں ہو دوستو!
منزل کو جانتا ہوں، مگر راستہ تو دو

تُم تو رجائیت کے پرستار ہو امامؔ!
فردا کی انجمن سے کوئی شمع لا تو دو

○

شب کا افسانۂ بے باک بیاں ہو یارو!
میں ہوں مرحوم، مگر تم تو جواں ہو یارو!

کل تلک شور تھا محفل میں کہ ہم اپنے ہیں
آج آواز تو دو مجھ کو، کہاں ہو یارو!

بے تعلّق تو نہ تھے اتنے سحر سے پہلے
چاند ڈوبا، تو یہاں ہو نہ وہاں ہو یارو!

میں نے ماضی کے در و بام سجا رکھّے ہیں
لے کے فردا کو چلے آؤ، جہاں ہو یارو!

خود شناسی کے لئے کوئی بہانہ، حیلہ
یہ بھی جینا ہے؟ یقیں ہو، نہ گماں ہو، یارو!

آؤ، توڑیں تو کسی طرح سکوتِ امروز
نغمۂ دوش کہ فردا کی فغاں ہو یارو!

عمر تھوڑی جو بچی ہے وہ گناہوں میں کٹے
ہاتھ میں جام ہو اور کوئے بتاں ہو یارو!

○

ہے بھرے درختوں کے باوجود بن تنہا
روز و شب کے ہنگامے، پھر بھی انجمن تنہا

رتجگوں کے وہ ساتھی کس جہاں میں بستے ہیں؟
کیا ہمیں تک آئے گی صبح کی کرن تنہا؟

رہ گئیں کہاں پیچھے گیسوؤں کی برساتیں؟
میرے گھر تک آئی ہے بوئے یاسمن تنہا

وہ تو خیر، یوں کہیئے، ذوقِ حُسن ہمدم تھا
جوئے شیر کیا لاتا عزم کوہکن تنہا!

ہائے یہ شبِ وعدہ، دل کا حال کیا کہیئے
حجلۂ عروسی میں جس طرح دُلہن تنہا

جانے کس شبستاں میں کون جاگتا ہوگا!
نصف شب کو نکلی ہے ایک گلبدن تنہا

○

پَل میں سب ختم ہوا، صرف تماشا ہی نہیں
آنکھ موجود، مگر دیکھنے والا ہی نہیں

روشنی کے لئے اِک عمر سُلگتے گزری
اور اب شمع مِلی ہے تو اندھیرا ہی نہیں

کتنے رستے تھے جو منزل کی طرف جاتے تھے
پاس پہنچے ہیں جو منزل کے، تو رستا ہی نہیں

آئینہ خانے میں آئے تھے بڑے فخر کے ساتھ
آنکھ نیچی ہے کہ اپنا کہیں چہرا ہی نہیں

اتنے نزدیک سے ہم اُس کی صدا کیا سُنتے!
دُور سے اُس نے کبھی ہم کو پُکارا ہی نہیں

صُبح کا بھُولا تو ہے، شام کو واپس آجائے
اور کہہ دے: "کبھی میں نے تمہیں چاہا ہی نہیں!"

محفلِ جشنِ طرب صبح تلک گرم رہی
خیر خواہوں کو وہاں ہم نے بُلایا ہی نہیں

یوں بھی کہتے تھے غزل ہم تو سرِ شامِ فراق
خیر سے آج ملاقات کا وعدہ ہی نہیں

کون رکھّے گا نئے دَور کی بُنیاد میں اینٹ؟
ہم نے مِٹتی ہوئی قدروں کو بچایا ہی نہیں

○

چہرۂ مایوس پر بھی بانکپن آیا تو ہے
ہم کو ہر حالت میں جی لینے کا فن آیا تو ہے

اپنے ہونٹوں پر لئے لالہ رُخوں کی داستاں
شہریاروں میں کوئی شعلہ دہن آیا تو ہے

جس سے وابستہ تھیں شامِ درد کی تنہائیاں
صبح کی صورت وہ سادہ پیرہن آیا تو ہے

کچھ خرد مندوں کی نکتہ چینیوں کے باوجود
میری طرزِ فکر میں دیوانہ پن آیا تو ہے

مُندمل ہوتا ہے کب تک، دیکھئے ناسورِ وقت
آج وہ نشتر زنِ زخمِ کہن آیا تو ہے

شُکر کر اے زندگی! اِک کج کلاہِ بزمِ شوق
لے کے اپنی آرزوؤں کی تھکن آیا تو ہے

○

اپنے رِستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی! میری طرف دیکھ، کہ میں آیا ہوں

کسی ویران جزیرے سے پُکارو مجھ کو
میں کراہوں کے سمندر میں نکل آیا ہوں

کام آئی ہے وہی چھاؤں، گھنی بھی جو نہ تھی
وقت کی دھوپ میں جس وقت میں کمُھلایا ہوں

خیریت پُوچھتے ہیں لوگ بڑے طنز کے ساتھ
جُرم بس یہ ہے کہ اِک شوخ کا ہمسایہ ہوں

صبح ہو جائے تو اُس پھُول کو دیکھوں، کہ جسے
میں شبستانِ بہاراں سے اُٹھا لایا ہوں

عصرِ نَو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

○

اپنی دیوارِ انا کا بھی سہارا نہ ہوئے
ہم پُجاری کے پُجاری رہے، دیوتا نہ ہوئے

جانے کیا تھا کہ اُسی سمت لُٹائے گئے پھول
ورنہ ہونے کو تو ہم آپ بھی کیا کیا نہ ہوئے

وقت کا شور سدا روح کے ہمراہ رہا
ہم اکیلے بھی رہے، پر کبھی تنہا نہ ہوئے

کوئی دیوار تو حائل تھی کہ ہم تم برسوں
ایک ہی گھر میں رہے، پھر بھی شناسا نہ ہوئے

اپنے ماضی ہی کو روتے رہے تا عُمر امام
مرثیہ گو تو ہوئے، شاعرِ فردا نہ ہوئے

○

ساتھ بہتے ہوئے دھارے کے نہیں بہہ سکتے
آپ کے رنگ میں ہم شعر نہیں کہہ سکتے

دشتِ احساس کی زنجیر لئے پھرتے ہیں
ہم کسی شہر میں آزاد نہیں رہ سکتے

نبضِ لمحات میں تھوڑی سی دھمک باقی ہے
ہم ابھی لاش کو بھی لاش نہیں کہہ سکتے

ہم سے کہتے ہیں کہ پتّھر کا جگر چیر کے لاؤ
پھول کی چوٹ بھی جو دل پہ نہیں سہہ سکتے

جانتے ہم بھی ہیں کیا چیز ہیں احبابِ عزیز
لیکن افسوس سرِ عام نہیں کہہ سکتے

کیا گلستاں کو نکھاریں گے نقیبانِ بہار
اپنے کمرے میں سلیقے سے نہیں رہ سکتے

شان سے چھاپتے ہیں جن کو مدیرانِ شہیر
کاش ہم ایک بھی ویسی ہی غزل کہہ سکتے

○

عاشقوں سے وہ اینٹھ لاتے ہیں — اپنے ماں باپ کے دُلارے ہیں!

کتنے نازک یہ آب گینے ہیں! — دوست اللہ کے سنوارے ہیں

کچھ حسینوں نے شاخِ گیسو پر — کیا حسیں گھونسلے بنائے ہیں!

اب بھی تجدیدِ رسم و راہ سہی — آپ تو اب بھی اچھے خاصے ہیں!

ساتھ چلنا بھی جن کو دوبھر تھا — اب وہی لوگ آگے آگے ہیں

چند مہمل سے شعر بھی کہیئے — شاعری کے نئے تقاضے ہیں!

بسترِ مرگ پر ہے اُردو زباں — لوگ عربی قرأت* پڑھتے ہیں

ان کی صورت تو دیکھیئے مظہر!
شاعری کا یہ ذوق رکھتے ہیں

* تلفظ کی یہ دونوں غلطیاں دانستہ ہیں۔

○

کم ظرف ہیں تنقید سے بیزار رہے ہیں
کہنے کو تو یہ لوگ قدح خوار رہے ہیں

کوچے میں حریفوں کے لئے پھرتے ہیں کشکول
جو محفلِ احباب میں خود دار رہے ہیں

وہ بھی نہ ہوئے رسم تجارت سے شناسا
جو لوگ کہ رسوا سرِ بازار رہے ہیں

جتنی بھی ہو، قیمت تو لگا دیجئے اپنی
ہم جنسِ گراں ہی کے خریدار رہے ہیں

میری ہی طرح کرتے ہیں اک کی شکایت
جو اپنے ہی خوابوں کے پرستار رہے ہیں

نقّاد ہیں، مظہر کو سخن فہم نہ کہیئے
یہ حضرتِ غالب کے طرفدار رہے ہیں

○

چوٹ کھائے ہوئے سانپوں سے بچایا ہوتا
ہم کو شہرت کے گڑھے میں نہ گرایا ہوتا

کتنی آنکھیں نگراں، کتنے دریچے وا تھے
دو قدم ہم نے کسی سمت بڑھایا ہوتا

لبِ گستاخ کو ہم کوئی سزا دے لیتے
تم نے ہونٹوں کا تقدّس تو بچایا ہوتا

دیکھتے ہم بھی ذرا داغِ تصنّع کی چمک
تم نے اخلاق کا چہرہ تو دکھایا ہوتا

آج ماضی کی کوئی بات بھی آتی نہیں یاد
کاش اِک شخص کو ہم نے نہ بھُلایا ہوتا

جانے وہ کون تھا، کیوں آیا تھا، کیا کہتا تھا
آپ نے اس کا تعارف تو کرایا ہوتا

○

اجنبی نگاہوں میں جب خلوص پائے گی
بے نشاں سرابوں میں عمر لوٹ جائے گی

ساحلِ تمنّا پر نیند اُڑ گئی سب کی
اب وہ موج کس کس کو گود میں سُلائے گی!

جسم کے سمندر میں، ڈوبنا تو آساں ہے
رُوح کے جزیرے تک کس کی ناؤ آئے گی!

اور ہم سے کیا ہوگا، اپنے دل کو سمجھا لیں:
صبح ہو نہ ہو لیکن رات بیت جائے گی!

یوں مجھے نہ طعنے دو، دیکھنا تھکن میری
تیز رَو زمانے کے ساتھ ساتھ جائے گی

○

تجھے بدنام کرنے پر تُلی ہے
گلی ہر راہ رو کو ٹوکتی ہے

مرا قصہ، مگر تجھ سے تہی ہے
تری باتوں میں کیا شائستگی ہے!

سکوتِ دشتِ بے خوابی میں پہروں
صدائے بربطِ شب گونجتی ہے

مری تخئیل کے افسردہ لب پر
وہ اپنے ہونٹ رکھ کر سو گئی ہے

وہاں تک خون کا دریا رواں ہے
جہاں تک لمس کی سرحد گئی ہے

○

جسم و جاں کے کانچ سے نازک رشتے ٹوٹ ہی جاتے ہیں
غم کے پھوڑے پکتے پکتے اِک دن پھُوٹ ہی جاتے ہیں

میری رقابت میں ہی آخر تم آئے تو منزل تک
سخت سفر میں ورنہ اکثر ساتھی چھُوٹ ہی جاتے ہیں

دل کو پتّھر کر لینے کا ہم نے کچھ فن سیکھا ہے
ایک ذرا سی ٹھیس پہ ورنہ شیشے ٹُوٹ ہی جاتے ہیں

چاہو تو ہُشیار رہو، ہُشیاری بھی بدہوشی ہے!
لُوٹنے والے خواب کی بستی اک دن لُوٹ ہی جاتے ہیں